اقبال کا فلسفہء خیر و شر

خلیفہ عبدالحکیم

کسی مذہب یا فلسفے میں خیر و شر کا نظریہ ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے ۔ انسان فطرتاً خیر کا طالب اور شر سے گریزاں ہے ۔ سقراط کی یہ تعلیم تھی کہ کوئی شخص بدی کو بدی جان کر اس کا مرتکب نہیں ہوتا ۔ ہر قسم کی بدی کا مرتکب اس کو کسی نہ کسی طرح کی بھلائی ہی سمجھ کر کرتا ہے۔ بدی کو بھلائی سمجھنا دراصل ہر قسم کی غلط کاری کی بنیاد ہے اور بدی کا ارتکاب صحیح علم کے نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر قسم کی بد اخلاقی درحقیقت جہالت کا نتیجہ ہے ۔ نیکی علم سے اور بدی جہل سے سرزد ہوتی ہے ۔ اسی طرح لذت اور تسکین کی خواہش بھی فطری ہے ۔ ایک ولی بھی آرزو کی تسکین چاہتا ہے اور ایک چور بھی۔ انسانوں میں فرق صرف اس سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس چیز سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ عادل کو عدل میں اور رحیم کو رحم میں مزا آتا ہے، عالم علم سے لذت اندوز ہوتا ہے اور ظالم ظلم سے ۔ چنگیز خان کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے فوجی سرداروں اور درباریوں سے یہ سوال کیا کہ بتاؤ کہ انسان کو سب سے زیادہ لذت کس موقع پر اور کس چیز سے حاصل ہوتی ہے؟ اپنے اپنے مزاج کے موافق مختلف سرداروں نے اس کا مختلف جواب دیا۔ کسی نے حصول عزت کا ذکر کیا، کسی نے نشہء فتوحات کا اور کسی نے جسمانی لذتوں کا نقشہ کھینچا ۔ سب کے جوابات سن کر چنگیز خان نے کہا کہ تم لوگوں نے جتنی لذتیں بیان کی ہیں وہ سب ادنیٰ درجے کی ہیں اور کسی میں انبساط کی وہ شدت نہیں جو اس موقع پر پیدا ہوتی ہے کہ دشمن کا کٹا ہوا سر تمہارے قدموں کے سامنے پڑا ہو اور اس کی بیوی بچوں کی آہ و زاری اور نالہ و فغاں جو سب نعمتوں سے زیادہ دلکش ہے، سنائی دے رہی ہو ۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ انسان کا لذت والم اور خیر و شر کا معیار کس قدر مختلف ہوتا ہے ۔ کسی مذہب کا اندازہ بھی اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس کی تعلیم میں خیر و شر کا کیا مفہوم ہے ۔ کسی فرد کا نظریہء حیات بھی حقیقت میں اس چیز کا نام ہے کہ وہ کس بات کو خیر اور کس کو شر سمجھتا ہے ۔ آئیے ، اقبال کے فلسفہء خیر و شر کی تمہید کے طور پر بڑے بڑے ادیان اور مشہور فلاسفہ کی تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالیں تاکہ اس تبصرے کے بعد اقبال کے نظریہء خیر و شر پر روشنی پڑ سکے اور اس کی امتیازی خصوصیت معلوم ہو سکے ۔ بدھ مت کو لیجئے ۔ گوتم بدھ ایک چھوٹی سی ریاست کے شہزادے تھے ۔ زمانہء بلوغ تک بدھ کو بڑے ناز و نعم میں

رکھا گیا اور اس امر کا اہتمام کیا گیا کہ وہ خود بھی ہر قسم کے شر سے محفوظ رہے اور دوسرے انسانوں کی بھی کسی قسم کی مصیبت اس کی آنکھوں کے سامنے نہ آئے ۔ اس کا شعور خیر محض سے آشنا اور شرور و آفات سے بیگانہ رہا ۔ لیکن یہ قدغن کب تک کام دے سکتی تھی؟ جب زندگی کے حقائق یک بیک اس کے سامنے آئے ، اس نے موت ، بیماری اور بڑھاپے کا مشاہدہ کیا تو وہ گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیوں ہے اور اس سے چھٹکارے کی کیا ترکیب ہو سکتی ہے ؟ ہندوستان کے مروّجہ ادیان اور فلسفے اس کو مطمئن نہ کر سکے ۔ وہ آزادانہ فکر تحقیق اور ذاتی تجربے سے اس نتیجے پر پہنچا جس کو غالب نے اس شعر میں ادا کیا ہے :

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس خیال سے بھی ایک قدم آگے بڑھا اور ذوق کا ہم نوا ہو کر پکار اٹھا :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مہاتما بدھ نے کہا کہ خالی موت سے بھی نجات نہ ہو سکے گی جب تک کہ تمام زندگی کی جڑ یعنی آرزو کا قلع قمع نہ کیا جائے ۔ جب تک کسی قسم کی بھی آرزو باقی رہے گی وہ ضرور زندگی کی کسی شکل میں صورت پذیر ہوگی اور یہ صورت پذیری لازماً باعث الم ہو گی ۔ زندگی کی کوئی چیز قابل اعتنا نہیں ہے۔ فنائے مطلق کے بغیر نجات محال ہے ۔ جاوید نامے میں اقبال نے فلک قمر کی سیر کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ وادیٔ طواسین میں پہنچا تو گوتم بدھ سے ملاقات ہوئی ۔ گوتم بدھ نے اپنا نظریۂ حیات ان شعار میں بیان کیا :

ہر چہ از محکم و پائندہ شناسی ، گزرد
کوہ و صحرا و بر و بحر و کران چیزے نیست
از خود اندیش و ازین بادیہ ترسان مگرز
کہ تو ہستی و وجود دو جہان چیزے نیست

شاید عالم بالا میں پہنچ کر گوتم بدھ نے اپنے نظریۂ حیات میں کچھ تبدیلی کر لی ہو ورنہ اس کی حقیقی تعلیم میں تو ''ہستی'' بھی نہیں ۔ اس کے ہاں تو نفس یا خودی یا روح بھی محض مظاہر و حوادث کی سیمیائی کیفیت ہی کا نام ہے ۔ اس کے ہاں زندگی ایسا گھاٹے کا سودا ہے کہ اس کو کسی شرط اور کسی قیمت اور کسی اجر کے ساتھ بھی قبول کرنا اود"یا (جہل) ہے ۔ بالفاظ دیگر زندگی اپنے تمام مظاہر میں شر ہی شر ہے اور اگر شر سے نجات حاصل

کرنا مقصد حیات ہے تو ہر قسم کی زندگی سے منہ پھیر لینا ہی صحیح راستہ ہے :

ترک دنیا ، ترک عقبیٰ ، ترک مولیٰ ، ترک ترک

عدمی عدم ، عدمی عدم ، زعدم چہ صرفہ بری عبث

ایسے تمام نظریات گریز کے نظریات ہیں ۔ دنیا اچھی نہیں ، زندگی میدان کارزار اور عرصۂ پیکار ہے جس میں جیت کہیں نہیں، ہار ہی ہار ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ جیتا وہ بھی در اصل ہارا ہی ہے۔

اقبال کو نطشے کے فلسفہ کے بعض پہلو حیات آفرین ہونے کی وجہ سے بہت پسند ہیں، اگرچہ اس کی نسبت بھی اقبال کی یہی رائے تھی کہ ''قلب او مومن دماغش کافرست'' ۔ نطشے کہتا ہے کہ مذاہب حقیقت میں فقط دو ہی قسموں کے ہوتے ہیں : ایک وہ جو زندگی کا اثبات کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کی نفی کرتے ہیں ۔ نفی کرنے والے مذاہب میں فنا پر اور فرار پر بہت زور ہے اور ان سلبی مذاہب میں رہبانیت ہی اصلی روحانیت سمجھی جاتی ہے ۔ دوسری طرف اثباتی مذاہب زندگی کو اس کی تمام تلخیوں کے باوجود ایک آزمائش گاہ ، میدان عمل اور نردبان عروج سمجھتے ہیں ۔ رکاوٹوں پر غالب آکر سیرت کو قوی کرنا اور مزاحم قوتوں کی تسخیر ان کا مطمح نظر ہوتا ہے ۔ اقبال کا زاویۂ نگاہ بھی یہی ہے ۔ اس کے ہاں خیر و شر کا پیمانہ لذت و الم کا پیمانہ نہیں ۔ اس کے ہاں جمود سب سے بڑا شر ہے اور حرکت میں برکت ہے۔ اس کو زندگی کے جمال کے ساتھ اس کا جلال بھی قبول ہے۔ دلبری کے ساتھ ساتھ اس کو قاہری بھی پسند ہے ۔ خدا کی صفات میں سے ''کل یوم ھو فی شان'' کی صفت اس کے افکار اور تاثرات میں سمائی اور سموئی ہوئی ہے ۔ فطرت میں جہاں جتنی زندگی ہے اتنی ہی خلاق ہے۔ حیات اور خلاق ہم معنی صفات ہیں ۔ اقبال کا مرشد عارف رومی کہ گیا تھا کہ ہر قسم کی کوشش جمود اور خفتگی پر فضیلت رکھتی ہے خواہ وہ کوشش بے ہودہ ہی ہو ع

کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

اقبال بھی اس رنگ میں خیر و شر کے عام معیار سے بلند ہوکر کہتا ہے :

چو از دست تو کار نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبال کو زندگی میں محض تکرار یا بغیر کسی جدت کے کسی طور عمل کو دھرانا روح فرسا معلوم ہوتا ہے ۔ اکثر زندگیاں بے جدت و ندرت محض تکرار اعمال ہی ہوتی ہیں :

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

اقبال کو جب فطرت میں بھی شب و روز کی محض تکرار معلوم ہوتی ہے تو وہ اکتا کر خدا سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ تو تو خلاق ہے، تیرے ہر فعل

میں جدت ہونی چاہئے، تیری آفریدہ فطرت میں یہ بے روح بھیک سی تکرار کیوں نظر آتی ہے:

طرح نو افگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم
این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

جدت پسند اور خلاق فطرتوں کو ایسی کائنات بھی جامد معلوم ہوتی ہے جو ایک مقررہ راستے پر چند قاعدوں کو دہراتی رہے اور اس میں ہر وقت نئے عالموں کی آفرینش نہ ہوتی رہے۔ دیوان غالب کے بھوپالی نسخے میں اسی نظریۂ حیات کا ایک لا جواب شعر ہے جو عام مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

وہ کہتا ہے کہ تمنائے حیات ہر قدم پر ایک کائنات کی آفرینش کرتی ہے۔ یہ ہماری تمام کائنات ارض و سما تمنا کا ایک نقش قدم ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا دوسرا قدم کسی اور عالم کی آفرینش کا باعث ہوا ہو۔ ہر روح اس دوسرے عالم کی طرف بڑھنے کے لئے بیتاب ہے لیکن معلوم نہیں کہ وہ قدم کہاں پڑا ہے؟ اقبال کے ہاں خیر، لذت اور سکون کے ہم معنی چیز نہیں کیوں کہ زندگی اگر ایک حالت پر قائم ہو جائے تو وہ خیر بھی جمود کی وجہ سے شر بن جاتا ہے۔ عام مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ نیک آدمی اعمال حسنہ کا اجر حاصل کر کے جنت ابدی میں مطمئن ہو جائے گا۔ جہاں زندگی کا اضطراب ختم ہو جاتا ہے وہاں ترقی کی ضرورت اور گنجائش نہیں رہتی، مقاصد آفرینی اور ان کے حصول کی کوشش کا کوئی سوال نہیں رہتا۔ بعض صوفیہ جو جنت کے عام تخیل سے اوپر گئے ہیں ان کے ہاں خیر مطلق واصل با اللہ ہو جانا ہے جہاں سفر حیات ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ انسان اپنی آخری منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ اقبال کا نظریۂ جنت جو اس کے نظریۂ خیر و شر کا آئینہ ہے لذت پرستوں، تن آسانوں اور سکون پسندوں سے بھی الگ ہے اور واصل با اللہ یا فنا ہونے والے صوفیوں سے بھی جداگانہ ہے:

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی　　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

وہ ابد الاباد تک جدت آفرینی اور خلاقی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس کے ہاں خیر کا تصور یہ ہے کہ زندگی اپنے ہی ممکنات کو ظہور میں لاتی رہے اور خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتی جائے۔ وہ باغ و شاہد و شراب کی جنت میں پہنچ کر آسودہ و مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ جنت میں پہنچتا ہے تو حور

اس سے شکایت کرتی ہے کہ تو رسم آشنائی سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے :

نہ بہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی
عجب این کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی

اقبال اس کا جواب دیتا ہے :

چہ کنم کہ فطرت من بمقام در نسازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آن زمان دل من پئے خوب ترنگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادہ بہارے قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
طلسم نہایت آن کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے
دل عاشقان بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے درد مندے نہ غمے نہ غمگسارے

ہر موجود سے غیر مطمئن ہو کر غیر موجود بلند تر مقام کی آرزو اور اس کے لئے جد و جہد حیات کا اصلی جوہر ہے۔ مولانا روم کی وہ غزل اقبال کو بہت پسند تھی جس کا یہ شعر ہے :

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزو ست

میرے طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ علامہ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ میں بتاؤں کہ انسان کس وقت مر جاتا ہے۔ کسی آدمی کو اس وقت مردہ شمار کرنا چاہئے جب اس میں نئے افکار کی قبولیت کی صلاحیت جاتی رہے اور اس کے طرز فکر اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی ممکن نہ رہے۔ ایسی حالت میں زندگی زندگی نہیں بلکہ مادے کی طرح محض تکرار عمل بن جاتی ہے۔ نور و ظلمت، یقین و گمان، خیر و شر اور علم و جہل کی کشاکش ہی ہے جس سے زندگی کا ارتقاء ہوتا ہے۔

جرمنی کے ایک مشہور فلسفی ادیب لیسنگ کا ایک قول مشہور ہے جو اقبال ہی کے نظریہ حیات کی عکاسی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خدا کے ایک ہاتھ میں صداقت ازلی ہو اور دوسرے ہاتھ میں تلاش حق اور وہ مجھے اس کا اختیار دے کہ ان میں سے جو چاہو وہ لے لو تو میں مودبانہ عرض کروں : " اے قادر

مطلق ! صداقت ازلی کو تو اپنے پاس ہی رہنے دے اور تلاش حق مجھے عنایت فرما ، کیونکہ فقط تیری ہی ذات مطلق ہے ۔ ذات مطلق کی یہ خصوصیت ہے کہ تو مطلق حق کا مالک ہوتے ہوئے بھی حی و قیوم رہ سکتا ہے۔ مجھے اگر معرفت کلی حاصل ہو گئی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا ۔ میری زندگی کا جوہر اصلی طلب اور کوشش ہے اور وہ اسی حالت میں باقی رہ سکتی ہے کہ تلاش حق میں ہمیشہ مشغول رہے '' ۔ خیر و شر کے متعلق اکثر مذہبوں اور فلسفوں میں یہ ایک معرکتہ الارا مسئلہ ہے کہ اگر خدا قادر مطلق اور رحیم و کریم ہے تو اس نے شر کو یا شر مجسم شیطان کو کیوں پیدا کیا اور فطرت کی الم آفرین اور کرب انگیز کیفیتوں کو عمل پیرا ہونے کی کیوں اجازت دی؟ اقبال کے نزدیک یہ مسئلہ انہیں نفوس کے لئے لاینحل ہوتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے آشنا نہیں ۔ زندگی مزاحمتوں پر مسلسل غلبہ حاصل کرنے کا نام ہے ۔ اگر شر یا مزاحمت و الم کا وجود نہ ہو تو خیر بھی مفقود جائے ۔ زندگی خیر و شر یا یزدان و شیطان کے محاربے کا نام ہے ۔ تمام سیرت سازی اور روح پروری اسی پیکار کی رہین منت ہے ۔ جو یہ پوچھتا ہے کہ زندگی میں شر کیوں ہے وہ حقیقت میں یہ پوچھ رہا ہے کہ زندگی کیوں ہے ۔ اقبال کہتا ہے کہ اگر زلیخا کا شر نہ ہو تو یوسف کے جوہر کیسے کھلیں ، اگر آتش نمرود نہ ہو تو باغ خلیل میں بہار کہاں سے آتی ، اگر فرعون کا تکبر نہ ہوتا تو موسیٰ کس طرح کلیم اللہ بنتے ، اگر طوفان نہ ہوتے شناوری کہاں سے ترق پاتی ، اگر اندیشہ و ہجران نہ ہو تو لذت وصال کہاں ۔ اقبال کے نزدیک اگر شیطان نہ ہوتا تو جہان بالکل بے لذت اور کور ذوق رہ جاتا ۔ شیطان اور شر کی شکایت کرنا زندگی اور خیر حقیقی کی ماہیت سے نا آشنائی کا نتیجہ ہے ۔ زندگی کی اصلی بھلائیاں متاع درد اور امکان نقصان ہی سے ظہور میں آتی ہیں ۔ عرفی نے حمد میں کیا حکیمانہ مطلع کہا ہے :

اے متاع درد در بازار جان انداختہ

گوہر ہر سود در جیب زیان انداختہ

فقط جامد طبیعتوں کے لئے ہی شر کا وجود خدا کی رحمت اور ربوبیت سے انکار کا باعث بنتا ہے ۔ لذت و سکون جنت پر اقبال کے اعتراضات سنئے :

کجا این روزگارے شیشہ بازے | بهشت ایں گنبد گردان نه دارد

ندیده درد زندان یوسف او | زلیخایش دل نالاں نه دارد

خلیل او حریف آتشے نیست | کلیمش یک‌شرر در جان نه دارد

به صرصر در نیفتد زورق او | خطر از لطمهٔ طوفان نه دارد

کجا آن لذت عقل غلط سیر — اگر منزل رہ پیچان نہ دارد
مزی اندر جہان کور ذوقے — کہ یزدان دارد و شیطان‌نہ دارد

مسلمانوں کو قرآن کریم نے یہ تعلیم دی کہ مومن خیر و شر دونوں کو من جانب اللہ مانتے ہوئے بھی خدا کو رحیم اور رب مانے ۔ یہ متضاد نما عقیدہ اسی حالت میں قابل فہم ہو سکتا ہے کہ خیر و شر کے اس تصور کو صحیح مانا جائے جیسے اقبال نے پیش کیا ہے ورنہ خدا بے رحم و عدل اور زندگی داستان الم رہ جاتی ہے ۔